۲

سُوْرَۃُ البَقَرَہ

نام اور تعداد آیات اس سورت کا نام سورۂ بقــرہ ہے، اور اسی نام سے حدیث اور آثار صحابہؓ میں اس کا ذکر موجود ہے، جس روایت میں سورۂ بقرہ کہنے کو منع کیا ہے وہ صحیح نہیں (ابن کثیر) تعداد آیات دو سو چھیاسی ۲۸۶ ہیں اور کلمات چھ ہزار دو سو اکیس اور حروف پچیس ہزار پانسو ہیں (ابن کثیر)

زمانۂ نزول یہ سورت مدنی ہے، یعنی ہجرتِ مدینہ طیبہ کے بعد نازل ہوئی، اگرچہ اس کی بعض آیات مکہ مکرمہ میں حج کے وقت نازل ہوئی ہیں، مگر وہ بھی باصطلاح مفسرین مدنی کہلاتی ہیں۔

سورۂ بقــرہ قرآن کریم کی سب سے بڑی سورت ہے، اور مدینہ طیبہ میں سب سے پہلے اس کا نزول شروع ہوا، اور مختلف زمانوں میں مختلف آیتیں نازل ہوتی رہیں، یہاں تک کہ ربا یعنی سود کے متعلق جو آیات ہیں وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر میں فتح مکہ کے بعد نازل ہوئیں، اور اس کی ایک آیت **وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ** (۲: ۲۸۱) **تو قرآن کی بالکل آخری آیت** ہے، جو سنہ ۱۰ ہجری میں ۱۰ ذی الحجہ کو منیٰ کے مقام پر نازل ہوئی، جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع کے فرائض ادا کرنے میں مشغول تھے، (قرطبی) اور اس کے اسّی نوّے دن کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی، اور وحیِ الٰہی کا سلسلہ ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔

فضائل سُورۂ بقرہ یہ قرآن کریم کی سب سے بڑی سورت اور بہت سے احکام پر مشتمل ہے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: "سورۂ بقــرہ کو پڑھا کرو، کیونکہ اس کا پڑھنا برکت ہے، اور اس کا چھوڑنا حسرت اور بدنصیبی ہے، اور اہلِ باطل اس پر قابو نہیں پا سکتے"

قرطبی نے حضرت معاویہؓ سے نقل کیا ہے کہ اس جگہ اہلِ باطل سے مراد جادوگر ہیں، مراد یہ ہے کہ اس سورت کے پڑھنے والے پر کسی کا جادو نہ چلے گا (قرطبی از مسلم بروایت ابو امامہ باہلی)

اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس گھر میں سورۂ بقرہ پڑھی جائے شیطان وہاں سے بھاگ جاتا ہے (ابن کثیر از حاکم)

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "سورۂ بقرہ سنام القرآن اور ذروۃ القرآن ہے"، سنام اور ذروہ ہر چیز کے اعلیٰ و افضل حصّہ کو کہا جاتا ہے، اس کی ہر آیت کے نزول کے وقت اسّی فرشتے اس کے جلو میں نازل ہوئے ہیں (ابن کثیر از مسند احمد) اور حضرت ابو ہریرہؓ کی ایک حدیث میں ہے کہ اس سورت میں ایک آیت ایسی ہے جو تمام آیات قرآن میں اشرف و افضل ہے، اور وہ آیت الکرسی ہے (ابن کثیر از ترمذی)

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا کہ: "سورۂ بقرہ کی دس آیتیں ایسی ہیں کہ اگر کوئی شخص اُن کو رات میں پڑھ لے تو اس رات کو جن، شیطان گھر میں داخل نہ ہوگا، اور اس کو اور اس کے اہل عیال کو اس رات میں کوئی آفت، بیماری، رنج و غم وغیرہ ناگوار چیز پیش نہ آئے گی، اور اگر یہ آیتیں کسی مجنون پر پڑھی جائیں تو اس کو افاقہ ہوجائے گا" وہ دس آیتیں یہ ہیں: چار آیتیں شروع سورۂ بقرہ کی پھر تین آیتیں درمیانی یعنی آیۃ الکرسی اور اس کے بعد کی دو آیتیں، پھر آخر سورۂ بقرہ کی تین آیتیں۔

احکام و مسائل

مضامین و مسائل کے اعتبار سے بھی سورۂ بقرہ کو ایک خاص امتیاز حاصل ہے، ابن عربیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بزرگوں سے سُنا ہے کہ سورۂ بقرہ میں ایک ہزار امر اور ایک ہزار نہی اور ایک ہزار حکمتیں، ایک ہزار خبر اور قصص ہیں (قرطبی و ابن کثیر) یہی وجہ ہے کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے جب سورۂ بقرہ کو تفسیر کے ساتھ پڑھا تو اس کی تعلیم میں بارہ سال خرچ ہوئے، اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے یہ سورت آٹھ سال میں پڑھی (قرطبی)

سورۂ فاتحہ درحقیقت پورے قرآن کا خلاصہ ہے، اس کے بنیادی مضامین تین ہیں: اوّل اللہ تعالیٰ کی ربوبیت، یعنی پروردگارِ عالم ہونے کا بیان، دوسرے اس کا مستحق عبادت ہونا، اور اس کے سوا کسی کا لائق عبادت نہ ہونا، تیسرے طلبِ ہدایت، سورۂ فاتحہ کا آخری مضمون صراطِ مستقیم کی ہدایت طلب کرنا ہے اور درحقیقت پورا قرآن اس کے جواب میں ہے، کہ جو شخص صراطِ مستقیم چاہتا ہو قرآن ہی میں ملے گا۔

اسی لئے فاتحہ کے بعد پہلی سورت سورۂ بقرہ رکھی گئی، اور اس کو ذٰلِكَ الْكِتٰبُ سے شروع کر کے اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ جس صراطِ مستقیم کو تم ڈھونڈتے ہو وہ یہ کتاب ہے۔

اس کے بعد اس سورت میں اوّل ایمان کے بنیادی اصول: توحید، رسالت، آخرت اجمالی طور پر اور آخر سورت میں ایمان مفصل بیان فرمایا گیا ہے، اور درمیان میں ہر شعبۂ زندگی: عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق، اصلاح ظاہر و باطن کے متعلق ہدایات کے بنیادی اصول اور اُن کے ساتھ بہت سی جزئیات بیان ہوئی ہیں۔

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ اٰيَاتُهَا ۲۸۶، رُكُوْعَاتُهَا ۴۰

سورۃ بقرہ مدنی ہے، اس میں ۲۸۶ آیتیں ہیں اور ۴۰ رکوع

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

شروع اللہ کے نام سے جو بیحد مہربان نہایت رحم والا ہے

الٓمّٓ ۝۱ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛۚ فِيْهِ ۛۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝۲

اس کتاب میں کچھ شک نہیں راہ بتلاتی ہے ڈرنے والوں کو،

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ

جو کہ یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا اور قائم رکھتے ہیں نماز کو اور جو ہم نے روزی دی ہے

يُنْفِقُوْنَ ۝۳ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ

اُن کو اس میں سے خرچ کرتے ہیں، اور وہ لوگ جو ایمان لائے اس پر کہ جو کچھ نازل ہوا تیری طرف اور اس پر

مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝۴ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى

کہ جو کچھ نازل ہوا تجھ سے پہلے اور آخرت کو وہ یقینی جانتے ہیں، وہی لوگ ہیں ہدایت پر اپنے

مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝۵

پروردگار کی طرف سے اور وہی ہیں مراد کو پہنچنے والے۔

خلاصہ تفسیر

یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شبہ نہیں (یعنی قرآن کے منجانب اللہ ہونے میں کسی شبہ

کی گنجائش نہیں، اگرچہ کوئی نافہم اس میں شبہ رکھتا ہو، کیونکہ یقینی بات کسی کے شبہ کرنے سے بھی حقیقت میں یقینی ہی رہتی ہے) راہ بتلانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو جو یقین لاتے ہیں چھپی ہوئی چیزوں پر (یعنی جو چیزیں اُن کے حواس وعقل سے پوشیدہ ہیں صرف اللہ و رسولؐ کے فرمانے سے ان کو صحیح مان لیتے ہیں) اور قائم رکھتے ہیں نماز کو (قائم رکھنا یہ ہے کہ اس کو پابندی کے ساتھ اس کے وقت میں پورے شرائط وارکان کے ساتھ ادا کریں) اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں (یعنی نیک کاموں میں) اور وہ لوگ ایسے ہیں کہ یقین رکھتے ہیں اس کتاب پر بھی جو آپ کی طرف اتاری گئی ہے اور اُن کتابوں پر بھی جو آپ سے پہلے اُتاری جاچکی ہیں (مطلب یہ ہے کہ اُن کا ایمان قرآن پر بھی ہے اور پہلی کتابوں پر بھی، اور ایمان سچا سمجھنے کو کہتے ہیں عمل کرنا دوسری بات ہے، جتنی کتابیں اللہ نے پہلے انبیاءؑ پر نازل فرمائی ہیں ان کو سچا سمجھنا فرض اور شرط ایمان ہے، یعنی یہ سمجھے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی تھیں وہ صحیح ہیں خودغرض لوگوں نے جو اس میں تبدیل وتحریف کی ہے وہ غلط ہے، رہ گیا عمل سو وہ صرف قرآن پر ہوگا، پہلی کتابیں سب منسوخ ہوگئیں، اُن پر عمل جائز نہیں) اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں، بس یہ لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو اُن کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب (یعنی ایسے لوگوں کو دنیا میں تو یہ نعمت ملی کہ راہِ حق ملی اور آخرت میں، ہر طرح کی کامیابی اُن کے لئے ہے)۔

حلِّ لُغات

ذٰلِكَ کسی دُور کی چیز کی طرف اشارہ کے لئے استعمال ہوتا ہے، رَيْبَ شک وشبہ، هُدًى ہدایت سے بنا ہے، اور ہدایت کے معنی رہنمائی، مُتَّقِيْنَ جن میں صفت تقویٰ ہو، تقویٰ کے لفظی معنی بچنے کے ہیں، مراد اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے بچنا ہے، غَيْب لفظی معنی ہر وہ چیز جو انسان کی نظر اور دوسرے حواس سماعت وغیرہ سے باہر ہو، يُقِيْمُوْنَ اقامت سے بنا ہے، جس کے معنی سیدھا کرنے کے ہیں، اور نماز کا سیدھا کرنا یہ ہے کہ آداب اور خشوع خضوع کے ساتھ ادا کی جائے، رَزَقْنٰهُمْ رزق سے بنا ہے، جس کے معنی ہیں روزی اور گذارے کا سامان دینا، يُنْفِقُوْنَ انفاق سے بنا ہے، خرچ کرنے کے معنی میں آتا ہے، اٰخِرَةٌ لغت میں مؤخر اور بعد میں آنے والی چیز کو آخرۃ کہا جاتا ہے، اس جگہ عالمِ دنیا کے مقابلے میں عالمِ آخرت بولا گیا، يُوْقِنُوْنَ ایقان سے ہے اور وہ یقین سے بنا ہے، اور یقین اس کو کہتے ہیں جس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہ ہو، مُفْلِحُوْنَ اِفلاح سے اور وہ فَلَاحٌ سے بنا ہے، فلاح کے معنی پوری کامیابی۔

معارف ومسائل

حروفِ مقطعہ جو بہت سی سورتوں کے شروع میں آتے ہیں اُن کی تحقیق

الۗمّۗ، بہت سی سورتوں کے شروع میں چند حرفوں سے مرکب ایک کلمہ لایا گیا ہے جیسے الۗمّۗ، حٰمۗ، الۗمّۗصۗ وغیرہ، ان کو

اصطلاح میں حروف مقطعہ کہا جاتا ہے، انمیں سے ہر حرف جُدا جُدا ساکن پڑھا جاتا ہے، الف، لام، میم،

حروف مقطعہ جو اوائل سُوَر میں آئے ہیں، اُن کے متعلق بعض مفسّرین نے فرمایا کہ یہ اُن سورتوں کے نام ہیں، بعض حضرات نے فرمایا کہ اسماءِ الٰہیہ کے رموز ہیں، مگر جمہور صحابہؓ و تابعینؒ اور علماءِ امت کے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ حروف رموز اور اسرار ہیں، جس کا علم سوائے خدا تعالیٰ کے کسی کو نہیں اور ہوسکتا ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم بطور ایک راز کے دیا گیا ہو، جس کی تبلیغ اُمت کے لئے روک دی گئی ہو، اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ان حروف کی تفسیر و تشریح میں کچھ منقول نہیں، امام تفسیر قرطبیؒ نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار فرمایا ہے، اُن کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ:-

"عامر شعبی، سفیان ثوریؒ اور ایک جماعت محدثین نے فرمایا ہے کہ ہر آسمانی کتاب میں اللہ تعالیٰ کے کچھ خاص رموز و اسرار ہوتے ہیں، اسی طرح یہ حروف مقطعہ قرآن میں حق تعالیٰ کا راز ہے، اس لئے یہ اُن متشابہات میں سے ہیں جن کا علم صرف حق تعالیٰ ہی کو ہے، ہمارے لئے ان میں بحث و گفتگو بھی جائز نہیں، مگر اس کے باوجود وہ ہمارے فائدے سے خالی نہیں، اوّل تو اُن پر ایمان لانا پھر اُن کا پڑھنا ہمارے لئے ثواب عظیم ہے، دوسرے اُن کے پڑھنے کے معنوی فوائد و برکات ہیں، جو اگرچہ ہمیں معلوم نہ ہوں مگر غیب سے وہ ہمیں پہونچتے ہیں"

پھر فرمایا:-

"حضرت صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ، عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ جمہور صحابہؓ کا ان حروف کے متعلق یہی عقیدہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اسرار ہیں، ہمیں اُن پر ایمان لانا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے ہیں، اور جس طرح آئے ہیں اُن کی تلاوت کرنا چاہئے، مگر معنی معلوم کرنے کی فکر میں پڑنا درست نہیں"

ابن کثیرؒ نے بھی قرطبیؒ وغیرہ سے نقل کرکے اسی مضمون کو ترجیح دی ہے، اور بعض اکابر علماء سے جو ان حروف کے معنی منقول ہیں اس سے صرف تمثیل و تنبیہ اور تسہیل مقصود ہے، یہ نہیں کہ مراد حق تعالیٰ یہ ہے، اس لئے اس کو بھی غلط کہنا تحقیق علماء کے خلاف ہے۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ لفظ ذٰلِكَ کسی دُور کی چیز کی طرف اشارے کے لئے آتا ہے، اور کِتٰبُ سے مراد قرآن کریم ہے، رَیْب کے معنی شک و شبہ، معنے یہ ہیں کہ یہ کتاب ایسی ہے جس میں کوئی شک و شبہ نہیں، یہ موقع بظاہر اشارۂ بعید کا نہیں تھا، کیونکہ اسی قرآن کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے جو لوگوں کے سامنے ہے، مگر اشارۂ بعید سے اس کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ سورۂ فاتحہ میں جس صراطِ مستقیم کی درخواست کی گئی تھی یہ سارا قرآن اس درخواست کا جواب بصورتِ قبولیت اور صراطِ مستقیم کی تشریح و تفصیل ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہم نے یہ دعا سُن لی اور قرآن

بھیج دیا، جو ہدایت کا آفتاب ہی، جو شخص ہدایت چاہتا ہے وہ اس کو پڑھے، سمجھے اور اس کے مقتضیٰ پر عمل کرے۔

اور پھر اس کے متعلق ارشاد ہے کہ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں، کیونکہ کسی کلام میں شک وشبہ کی دو صورتیں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ خود کلام میں غلطی ہو، تو وہ کلام محلِ شک وشبہ ہو جاتا ہے، دوسرے یہ کہ سمجھنے والے کی فہم میں غلطی ہو، اس صورت میں کلام محلِ شک وشبہ نہیں ہوتا، گو کج فہمی یا کم فہمی کی وجہ سے کسی کو شبہ ہو جائے، جس کا ذکر قرآن کریم میں چند آیتوں کے بعد اِنۡ کُنۡتُمۡ فِیۡ رَیۡبٍ میں آیا ہے۔

اس لئے ہزاروں کم فہموں یا کج فہموں کے شبہات واعتراضات کے باوجود یہ کہنا صحیح ہی کہ اس کتاب میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

ھُدًی لِّلۡمُتَّقِیۡنَ، ہدایت ہے خدا سے ڈرنے والوں کے لئے، یعنی مخصوص ہدایت جو نجاتِ آخرت کا ذریعہ بنے، وہ متقین ہی کا حصّہ ہے، اگرچہ قرآن کی ہدایت نہ صرف نوعِ بشر کے لئے بلکہ تمام کائناتِ عالم کے لئے عام ہے، سورۃ فاتحہ کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے کہ ہدایت کے تین درجے ہیں، ایک درجہ تمام نوعِ انسان بلکہ تمام حیوانات وغیرہ کے لئے بھی عام اور شامل ہے، دوسرا درجہ مؤمنین کے لئے خاص اور تیسرا درجہ مقربینِ خاص کے لئے مخصوص ہے، پھر اس کے درجات کی کوئی حد وانتہاء نہیں، قرآن کریم کے مختلف مواقع میں کہیں ہدایتِ عامہ کا ذکر آیا ہے کہیں ہدایت خاصّہ کا، اِس جگہ ہدایت خاصّہ کا ذکر ہے، اس لئے متقین کی تخصیص کی گئی ہی، اس پر یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہدایت کی زیادہ ضرورت تو ان لوگوں کو ہے جو متقی نہیں، کیونکہ مذکورہ تحقیق سے معلوم ہوگیا کہ اس جگہ متقین کی خصوصیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن غیر متقی لوگوں کے لئے ہدایت نہیں ہے۔

متقین کی خاص صفات اس کے بعد دو آیتوں میں متقین کی مخصوص صفات وعلامات بیان کرکے یہ بتلا دیا گیا ہے کہ یہ جماعت ہدایت یافتہ ہے، انھیں کا راستہ صراطِ مستقیم ہے، جس کو سیدھا راستہ مطلوب ہو، اس جماعت میں شامل ہو جائے اُن کے ساتھ رہے، اُن کے عقائد ونظریات اور اعمال واخلاق کو اپنا نصب العین بنائے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ متقین کی مخصوص صفات بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے اُولٰٓئِکَ عَلٰی ھُدًی مِّنۡ رَّبِّھِمۡ وَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ، یعنی یہی لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو اُن کے رب کی طرف سے ملی ہے، اور یہی لوگ ہیں پورے کامیاب۔

متقین کی صفات جو ان دو آیتوں میں بیان ہوئی ہیں ان میں ایمان کی اجمالی تعریف اور اس کے بنیادی اصول بھی آگئے ہیں، اور عملِ صالح کے بنیادی اصول بھی، اس لئے ان صفات کو ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔

اَلَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝

"یعنی خدا سے ڈرنے والے لوگ ایسے ہیں کہ یقین کرتے ہیں بے دیکھی چیزوں کا، اور قائم رکھتے ہیں نماز کو، اور جو ہم نے روزی دی ہے اُس میں سے کچھ خرچ کرتے ہیں"۔

اس آیت میں متقین کی تین صفات بیان کی گئی ہیں: ایمان بالغیب، اقامتِ صلوٰۃ، اللہ کی راہ میں خرچ کرنا، اس کے ضمن میں بہت سے اہم مسائل آگئے ہیں، ان کو کسی قدر تفصیل سے لکھا جاتا ہے۔

پہلا مسئلہ: ایمان کی تعریف

ایمان کی تعریف کو قرآن نے يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ کے صرف دو لفظوں میں پورا بیان کر دیا ہے، لفظ ایمان اور غیب کے معنی سمجھ لئے جاویں تو ایمان کی پوری حقیقت اور تعریف سمجھ میں آجاتی ہے۔

لغت میں کسی کی بات کو کسی کے اعتماد پر یقینی طور سے مان لینے کا نام ایمان ہے، اسی لئے محسوسات و مشاہدات میں کسی کے قول کی تصدیق کرنے کو ایمان نہیں کہتے، مثلاً کوئی شخص سفید کپڑے کو سفید یا سیاہ کو سیاہ کہہ رہا ہے اور دوسرا اس کی تصدیق کرتا ہے اس کو تصدیق کرنا تو کہیں گے ایمان لانا نہیں کہا جائے گا، کیونکہ اس تصدیق میں قائل کے اعتماد کو کوئی دخل نہیں، بلکہ یہ تصدیق مشاہدہ کی بناء پر ہے، اور اصطلاحِ شرع میں خبرِ رسولؐ کو بغیر مشاہدہ کے محض رسولؐ کے اعتماد پر یقینی طور سے مان لینے کا نام ایمان ہے، لفظ غیب لغت میں ایسی چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے جو نہ بدیہی طور پر انسان کو معلوم ہوں، اور نہ انسان کے حواس خمسہ اس کا پتہ لگا سکیں، یعنی نہ وہ آنکھ سے نظر آئیں، نہ کان سے سنائی دیں، نہ ناک سے سونگھ کر یا زبان سے چکھ کر اُن کا علم ہوسکے، اور نہ ہاتھ سے چھو کر اُن کو معلوم کیا جاسکے۔

قرآن میں لفظ غیب سے وہ تمام چیزیں مراد ہیں جن کی خبر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے، اور ان کا علم بداہتِ عقل اور حواس خمسہ کے ذریعہ نہیں ہوسکتا، اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات بھی آجاتی ہیں، تقدیری امور، جنت و دوزخ کے حالات، قیامت اور اس میں پیش آنیوالے واقعات بھی، فرشتے، تمام آسمانی کتابیں اور تمام انبیاء سابقینؑ بھی جس کی تفصیل اسی سورۂ بقرہ کے ختم پر اٰمَنَ الرَّسُوْلُ میں بیان کی گئی ہے، گویا یہاں ایمان مجمل کا بیان ہوا ہے، اور آخری آیت میں ایمانِ مفصّل کا۔

تو اب ایمان بالغیب کے معنے یہ ہوگئے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ہدایات و تعلیمات لے کر آئے ہیں اُن سب کو یقینی طور پر دل سے ماننا، شرط یہ ہے کہ اس تعلیم کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہونا قطعی طور پر ثابت ہو، جمہور اہل اسلام کے نزدیک ایمان کی یہی تعریف ہے (عقیدۂ طحاوی عقائد نسفی وغیرہ)

اس تعریف میں ماننے کا نام ایمان بتلایا گیا ہے، اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ محض جاننے کو ایمان

نہیں کہتے، کیونکہ جہاں تک جاننے کا تعلق ہے وہ تو ابلیس و شیطان اور بہت سے کفار کو بھی حاصل ہے، کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صدق کا یقین تھا، مگر اس کو مانا نہیں اس لئے وہ مؤمن نہیں۔

دوسرا مسئلہ: اقامتِ صلوٰۃ

اقامت کے معنی محض نماز پڑھنے کے نہیں، بلکہ نماز کو ہر جہت اور ہر حیثیت سے درست کرنے کا نام اقامت ہے، جس میں نماز کے تمام فرائض، واجبات، مستحبات اور پھر اُن پر دوام و التزام، یہ سب اقامت کے مفہوم میں داخل ہیں، اور صحیح یہ ہے کہ اس جگہ نماز سے کوئی خاص نماز مراد نہیں، بلکہ فرائض و واجبات اور نفلی نمازوں کو یہ لفظ شامل ہے، خلاصۂ مضمون یہ ہوا کہ وہ لوگ جو نمازوں کی پابندی بھی قواعدِ شرعیہ کے مطابق کرتے ہیں، اور اُن کے پورے آداب بھی بجالاتے ہیں۔

تیسرا مسئلہ: اللہ کی راہ میں خرچ کرنا

اس میں بھی صحیح اور تحقیقی بات جس کو جمہور مفسرین نے اختیار فرمایا ہے، یہی ہے کہ ہر قسم کا وہ خرچ داخل ہے جو اللہ کی راہ میں کیا جائے، خواہ فرض زکوٰۃ ہو، یا دوسرے صدقات واجبہ یا نفلی صدقات و خیرات، کیونکہ قرآن کریم میں جہاں کہیں لفظ انفاق استعمال ہوا عموماً نفلی صدقات میں یا عام معنی میں استعمال کیا گیا ہے، زکوٰۃ فرض کے لئے عموماً لفظ زکوٰۃ ہی آیا ہے۔

اس مختصر جملہ میں لفظ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ پر غور کیجئے تو ایک طرف یہ لفظ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا ایک قوی داعیہ شریف انسان کے دل میں پیدا کر دیتا ہے کہ جو کچھ مال ہمارے پاس ہے یہ سب خدا ہی کا عطا کیا ہوا اور اسی کی امانت ہے، اگر ہم اس تمام مال کو بھی اللہ کی راہ میں اس کی رضا کے لئے خرچ کر دیں تو حق اور بجا ہے، اس میں بھی ہمارا کوئی احسان نہیں ؎

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس پر مزید اضافہ لفظ مِمَّا نے کر دیا، جس کے معنے یہ ہیں کہ ہمارے دیئے ہوئے مال کو بھی پورا خرچ کرنا نہیں، بلکہ اس کا کچھ حصہ خرچ کرنا ہے۔

یہاں متقین کی صفات کا بیان کرتے ہوئے اوّل ایمان بالغیب کا ذکر فرمایا گیا، پھر اقامتِ نماز اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا، ایمان کی اہمیت تو سب کو معلوم ہے، کہ وہی اصل الاصول اور سارے اعمال کی مقبولیت کا دار و مدار ہے، لیکن جب ایمان کے ساتھ اعمال کا بیان کیا جاتا ہے تو ان کی فہرست طویل اور فرائض و واجبات کی تعداد کثیر ہے، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اعمال میں سے صرف دو عمل نماز اور انفاقِ مال کے ذکر پر اکتفاء کرنے میں کیا راز ہے؟

اس میں غالباً اسی طرف اشارہ ہے کہ جتنے اعمال انسان پر فرض یا واجب ہیں ان کا تعلق

یا انسان کی ذات اور بدن سے ہے یا اس کے مال سے، بدنی اور ذاتی عبادات میں سب سے اہم نماز ہے. اس کا ذکر کرنے پر اکتفا کیا گیا، اور مالی عبادات سب کی سب لفظ انفاق میں داخل ہیں، اس لئے درحقیقت یہ تنہا دو اعمال کا ذکر نہیں، بلکہ تمام اعمال وعبادات اُن کے ضمن میں آگئے، اور پوری آیت کے یہ معنی ہوگئے کہ متقین وہ لوگ ہیں جن کا ایمان بھی کامل ہے اور عمل بھی، اور ایمان وعمل کے مجموعہ کا نام ہی اسلام ہے، گویا اس آیت میں ایمان کی مکمل تعریف کے ساتھ اسلام کے مفہوم کی طرف بھی اشارہ ہوگیا، اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ اس جگہ اس کی بھی وضاحت کردی جائے کہ ایمان اور اسلام میں کیا فرق ہے؟

ایمان اور اسلام میں فرق

لغت میں ایمان کسی چیز کی دل سے تصدیق کرنے کا نام ہے، اور اسلام اطاعت و فرمانبرداری کا، ایمان کا محل قلب ہے، اور اسلام کا بھی قلب اور سب اعضاء وجوارح لیکن شرعاً ایمان بغیر اسلام کے اور اسلام بغیر ایمان کے معتبر نہیں، یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ کی محض دل میں تصدیق کرلینا شرعاً اس وقت تک معتبر نہیں جب تک زبان سے اس تصدیق کا اظہار اور اطاعت وفرمانبرداری کا اقرار نہ کرے، اسی طرح زبان سے تصدیق کا اظہار یا فرمانبرداری کا اقرار اُس وقت تک معتبر نہیں جب تک دل میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی تصدیق نہ ہو۔

خلاصہ یہ ہے کہ لغت کے اعتبار سے ایمان اور اسلام الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں، اور قرآن وحدیث میں اسی لغوی مفہوم کی بناء پر ایمان اور اسلام میں فرق کا ذکر بھی ہے، مگر شرعاً ایمان بدون اسلام کے اور اسلام بدون ایمان کے معتبر نہیں۔

جب اسلام یعنی ظاہری اقرار و فرمانبرداری کے ساتھ دل میں ایمان نہ ہو تو اس کو قرآن کی اصطلاح میں نفاق کا نام دیا گیا ہے، اور اس کو کھلے کفر سے زیادہ شدید جرم ٹھہرایا ہے۔

اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ج (۴: ۱۴۸)	"یعنی منافقین جہنم کے سب سے نیچے کے طبقہ میں رہیں گے۔"

اسی طرح ایمان یعنی تصدیقِ قلبی کے ساتھ اگر اقرار و اطاعت نہ ہو تو اس کو بھی قرآنی

نصوص میں کفر ہی قرار دیا ہے، ارشاد ہے :- یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (۲: ۱۴۶) یعنی یہ کفار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی حقانیت کو ایسے یقینی طریق پر جانتے ہیں جیسے اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں "

اور دوسری جگہ ارشاد ہے :-
وَجَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَآ اَنْفُسُهُمْ ظُلْمًا وَّعُلُوًّا ؕ (۲۷: ۱۴) "یعنی یہ لوگ ہماری آیات کا انکار کرتے ہیں، حالانکہ اُن کے دلوں میں اُن کا یقین کامل ہے، اور اُن کی یہ حرکت محض ظلم و تکبر کی وجہ سے ہے "

میرے استاذ محترم حضرت العلّامہ سیّد محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ، اس مضمون کو اس طرح بیان فرماتے تھے کہ ایمان اور اسلام کی مسافت ایک ہی، فرق صرف ابتداء و انتہاء میں ہے، یعنی ایمان قلب سے شروع ہوتا ہے اور ظاہر عمل پر پہونچ کر مکمل ہوتا ہے، اور اسلام ظاہر عمل سے شروع ہوتا ہے اور قلب پر پہونچ کر مکمل سمجھا جاتا ہے، اگر تصدیق قلبی ظاہری اقرار و اطاعت تک نہ پہونچے وہ تصدیق ایمان معتبر نہیں، اسی طرح اگر ظاہری اطاعت و اقرار تصدیق قلبی تک نہ پہونچے تو وہ اسلام معتبر نہیں۔

امام غزالیؒ اور امام سبکیؒ کی بھی یہی تحقیق ہے، اور امام ابن ہمام نے مسامرہ میں اس تحقیق پر تمام اہل حق کا اتفاق ذکر کیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝ یعنی "متقین ایسے ہیں کہ ایمان رکھتے ہیں اُس کتاب پر بھی جو آپؐ کی طرف اُتاری گئی اور اُن کتابوں پر بھی جو آپؐ سے پہلے اُتاری جا چکی ہیں اور آخرت پر بھی وہی لوگ یقین رکھتے ہیں"۔

اس آیت میں متقین کی باقی صفات کا بیان ہے جس میں ایمان بالغیب کی کچھ تفصیل اور ایمان بالآخرت کا ذکر ہے، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم نے اس کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ عہد رسالتؐ میں مومنین متقین دو طرح کے حضرات تھے، ایک وہ جو پہلے مشرکین میں سے تھے، پھر مشرف باسلام ہوئے، دوسرے وہ جو پہلے اہلِ کتاب یہودی یا نصرانی تھے، پھر مسلمان ہوگئے، اس سے پہلی آیت میں پہلے طبقہ کا ذکر تھا، اور اس آیت میں دوسرے طبقہ کا ذکر ہے، اسی لئے اس آیت میں قرآن پر ایمان لانے کے ساتھ پچھلی آسمانی کتابوں پر ایمان لانے کی بھی تصریح فرمائی گئی کہ وہ حسبِ تصریح حدیث دوہرے ثواب کے مستحق ہیں، ایک پچھلی کتابوں کے زمانے میں ان پر ایمان لانے اور عمل کرنے کا ثواب، دوسرے قرآن کے زمانے میں قرآن پر ایمان لانے اور عمل کرنے کا ثواب، پچھلی آسمانی کتابوں پر ایمان لانا آج بھی ہر مسلمان کے لئے لازم ہے، فرق اتنا ہے

کہ آج ان کتابوں پر ایمان اس طرح ہوگا کہ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے اُن کتابوں میں نازل فرمایا تھا وہ سب حق ہے، اور اُس زمانے کے لئے وہی واجب العمل تھا، مگر قرآن نازل ہونے کے بعد چونکہ پچھلی کتابیں اور شریعتیں سب منسوخ ہوگئیں، تو اب عمل صرف قرآن ہی پر ہوگا۔

مسئلۂ ختمِ نبوّت کی ایک واضح دلیل

آیت کے اس طرزِ بیان سے ایک اہم اصولی مسئلہ بھی نکل آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں، اور آپؐ کی وحی آخری وحی، کیونکہ اگر قرآن کے بعد کوئی اور کتاب یا وحی بھی نازل ہونے والی ہوتی تو جس طرح اس آیت میں پچھلی کتابوں اور وحی پر ایمان لانا ضروری قرار دیا گیا ہے اسی طرح آئندہ نازل ہونے والی کتاب اور وحی پر ایمان لانے کا ذکر بھی ضروری ہوتا، بلکہ اس کی ضرورت زیادہ تھی، کیونکہ تورات و انجیل اور تمام کتبِ سابقہ پر ایمان لانا تو پہلے سے جاری اور معلوم تھا، اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی سلسلۂ وحی اور نبوّت جاری ہوتا تو ضرورت اس کی تھی کہ اس کتاب اور اس نبی کا ذکر زیادہ اہتمام سے کیا جاتا جو بعد میں آنے والے ہوں تاکہ کسی کو اشتباہ نہ رہے۔

مگر قرآن نے جہاں ایمان کا ذکر کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نازل ہونے والی وحی اور پہلے انبیاءؑ کا ذکر فرمایا، بعد میں آنے والی کسی وحی یا نبی کا کہیں قطعاً ذکر نہیں، پھر صرف اسی آیت میں نہیں بلکہ قرآن کریم میں یہ مضمون اوّل سے آخر تک مختلف مقامات میں چالیس پچاس آیتوں میں آیا ہے، سب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیاءؑ، پہلی وحی، پہلی کتابوں کا ذکر ہے، کسی ایک آیت میں اس کا اشارہ تک نہیں کہ آئندہ بھی کوئی وحی یا نبی آنے والا ہے، جس پر ایمان لانا ہے، مثلاً ارشاد ہے:

(۱) وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ (سورۂ نحل: ۴۳) (۲) وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ (سورۂ مومن: ۷۸) (۳) وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ رُسُلًا (سورۂ روم: ۴۷) (۴) وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ (سورۂ نساء: ۶۰) (۵) وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ (سورۂ زمر: ۶۵) (۶) كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ (سورۂ شوریٰ: ۳) (۷) كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ (بقرہ: ۱۸۳) (۸) سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا (اسرائیل: ۷۷)

ان آیات میں اور ان کی امثال دوسری آیات میں جہاں کہیں نبی یا رسول یا وحی و کتاب بھیجنے کا ذکر ہے سب کے ساتھ مِنْ قَبْلِ اور مِنْ قَبْلِكَ کی قید لگی ہوئی ہے، کہیں مِنْۢ بَعْدِ کا اشارہ تک نہیں، اگر ختمِ نبوّت اور انقطاعِ وحی کا دوسری آیات میں صراحۃً ذکر نہ ہوتا تو قرآن کا یہ طرز ہی اس مضمون کی شہادت کے لئے کافی تھا، مسئلہ ختمِ نبوت پر قرآنی تصریحات اور احادیثِ متواترہ کی شہادت اور امّت کا اجماع تفصیل کے ساتھ دیکھنا ہو تو میرا رسالہ "ختمِ نبوّت" دیکھا جائے۔

متقین کی تفسیر میں صفتِ ایمان بالآخرۃ

اس آیت میں متقین کی دوسری صفت یہ بیان فرمائی گئی کہ وہ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، آخرت سے مراد وہ دارِ آخرت ہے جس کو قرآن میں دار القرار، دار الحیوان اور عقبیٰ کے نام سے بھی ذکر کیا گیا ہے، اور پورا قرآن اس کے ذکر اور اس کے ہولناک حالات سے بھرا ہوا ہے۔

آخرت پر ایمان ایک انقلابی عقیدہ ہے

آخرت پر ایمان لانا اگرچہ ایمان بالغیب کے لفظ میں آچکا ہے، مگر اس کو پھر صراحۃً اس لئے ذکر کیا گیا کہ یہ اجزائے ایمان میں اس حیثیت سے سب میں اہم جزء ہے کہ مقتضائے ایمان پر عمل کا جذبہ پیدا کرنا اسی کا اثر ہے۔

اور اسلامی عقائد میں یہی وہ انقلابی عقیدہ ہے جس نے دنیا کی کایا پلٹ کر کے دی، اور جس نے آسمانی تعلیم پر عمل کرنے والوں کو پہلے اخلاق و اعمال میں اور پھر دنیا کی سیاست میں بھی تمام اقوامِ عالم کے مقابلے میں ایک امتیازی مقام عطا فرمایا، اور جو عقیدہ توحید و رسالت کی طرح تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام شرائع میں مشترک اور متفق علیہ چلا آتا ہے۔

وجہ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کے سامنے صرف دنیا کی زندگی اور اسی کی عیش و عشرت ان کا انتہائی مقصود ہے، اسی کی تکلیف کو تکلیف سمجھتے ہیں، آخرت کی زندگی اور اعمال کے حساب کتاب اور جزاء و سزا کو وہ نہیں مانتے، وہ جب جھوٹ، سچ اور حلال حرام کی تفریق کو اپنی عیش و عشرت میں خلل انداز ہوتے دیکھیں تو اُن کو جرائم سے روکنے والی کوئی چیز باقی نہیں رہتی، حکومت کے تعزیری قوانین قطعاً انسداد جرائم اور اصلاحِ اخلاق کے لئے کافی نہیں، عادی مجرم تو اُن سزاؤں کے عادی ہوہی جاتے ہیں، کوئی شریف انسان اگر تعزیری سزا کے خوف سے اپنی خواہشات کو ترک بھی کرے تو اسی حد تک کہ اس کو حکومت کی دار و گیر کا خطرہ ہو، خلوتوں میں اور رازدارانہ طریقوں پر جہاں حکومت اور اس کے قوانین کی رسائی نہیں، اُسے کون مجبور کر سکتا ہے کہ اپنی عیش و عشرت اور خواہش کو چھوڑ کر پابندیوں کا طوق اپنے گلے میں ڈال لے۔

ہاں وہ صرف عقیدۂ آخرت اور خوفِ خدا ہی ہے جس کی وجہ سے انسان کی ظاہری اور باطنی حالت جلوت و خلوت میں یکساں ہو سکتی ہے، وہ یہ یقین رکھتا ہے کہ مکان کے بند دروازوں اور اُن پر پہرہ چوکیوں میں اور رات کی تاریکیوں میں بھی کوئی دیکھنے والا مجھے دیکھ رہا ہے، کوئی لکھنے والا میرے اعمال کو لکھ رہا ہے۔

یہی وہ عقیدہ تھا جس پر پورا عمل کرنے کی وجہ سے اسلام کے ابتدائی دور میں ایسا پاکباز معاشرہ پیدا ہوا کہ مسلمانوں کی صورت دیکھ کر، چال چلن دیکھ کر لوگ دل و جان سے اسلام کے گرویدہ ہو جاتے تھے، یہاں یہ بات بھی قابلِ نظر ہے کہ اس آیت میں بِالْاٰخِرَةِ کے ساتھ لفظ یُؤْمِنُوْنَ

نہیں، بلکہ یُوْقِنُوْنَ استعمال فرمایا گیا ہے، کیونکہ ایمان کا مقابل تکذیب ہے، اور ایقان کا مقابل شک و تردد، اس میں اشارہ ہے کہ آخرت کی زندگی کی محض تصدیق کرنا مقصد کو پورا نہیں کرتا، بلکہ اس کا ایسا یقین ضروری ہے جیسے کوئی چیز آنکھوں کے سامنے ہو، مُتَّقِیْن کی یہی صفت ہے کہ آخرت میں حق تعالیٰ کے سامنے پیشی اور حساب کتاب، پھر جزاء و سزاء کا نقشہ ہر وقت اُن کے سامنے رہتا ہے۔

وہ شخص جو دوسروں کا حق غصب کرنے کے لئے جھوٹے مقدمے لڑتا ہے، جھوٹی گواہی دے رہا ہے، اللہ تعالیٰ کے فرمان کے خلاف حرام مال کمانے اور کھانے میں لگا ہوا ہے، یا دنیا کے ذلیل مقاصد حاصل کرنے کے لئے خلافِ شرع ذرائع اختیار کر رہا ہے، وہ ہزار بار آخرت پر ایمان لانے کا اقرار کرے اور ظاہر شریعت میں اس کو مؤمن کہا بھی جائے، لیکن قرآن جس ایقان کا مطالبہ کرتا ہے وہ اسے حاصل نہیں، اور وہی انسان کی زندگی میں انقلاب لانیوالی چیز ہے اُسی کے نتیجے میں متقین کو ہدایت اور کامیابی کا وہ انعام دیا گیا ہے جس کا ذکر سورۂ بقرہ کی پانچویں آیت میں ہے، اُولٰٓئِكَ عَلٰی هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ یعنی "بس یہی لوگ ہیں ٹھیک راہ پر جو اُن کے پروردگار کی طرف سے ملی ہے، اور یہ لوگ ہیں پورے کامیاب"۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ

بیشک جو لوگ کافر ہو چکے برابر ہے اُن کو تو ڈرائے یا نہ ڈرائے، وہ

لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝۶ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى

ایمان نہ لائیں گے، مہر کر دی اللہ نے اُن کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر اور

اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝۷ ع

ان کی آنکھوں پر پردہ ہے، اور اُن کے لئے بڑا عذاب ہے

ع ۱ / ۱

خلاصۂ تفسیر

بیشک جو لوگ کافر ہو چکے ہیں برابر ہے اُن کے حق میں خواہ آپ ان کو ڈرائیں یا نہ ڈرائیں، وہ ایمان نہ لاویں گے (یہ بات اُن کافروں کے متعلق ہے جن کی نسبت خدا تعالیٰ کو معلوم ہے کہ ان کا خاتمہ کفر پر ہوگا، عام کافر مراد نہیں، ان میں بہت سے لوگ بعد میں مسلمان ہوگئے) بند لگا دیا ہے اللہ نے انکے دلوں پر اور اُن کے کانوں پر اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے، اور ان کے لئے سزا بڑی ہے۔

معارف و مسائل

خلاصۂ مضمون مع ربط

سورۂ بقرہ کی پہلی پانچ آیتوں میں قرآن کریم کا کتابِ ہدایت اور ہر شک و شبہ سے بالاتر ہونا بیان کرنے کے بعد اُن خوش نصیب لوگوں کا ذکر تھا، جنھوں نے اس کتابِ ہدایت سے پورا فائدہ اُٹھایا، جن کو قرآن کی اصطلاح میں مؤمنین اور متقین کا لقب دیا گیا ہے، اور ان حضرات کی مخصوص صفات و علامات بھی بیان کی گئیں، اس کے بعد پندرہ آیتوں میں اُن لوگوں کا ذکر ہے جنھوں نے اس ہدایت کو قبول نہیں کیا، بلکہ انکار و عناد سے پیش آئے۔

پھر اُن لوگوں میں دو گروہ تھے، ایک وہ جنھوں نے کھل کر انکار و مخالفت کا راستہ اختیار کیا جن کو قرآن کی اصطلاح میں کافر کہا گیا، دوسرے وہ لوگ جو اپنی اخلاقی پستی اور دنیا کی ذلیل اغراض کی بناء پر یہ جرأت بھی نہ کرسکے کہ اپنے ضمیر کی آواز اور دلی عقیدے کو صاف طور پر ظاہر کردیتے، بلکہ دھوکہ اور فریب کی راہ اختیار کی، مسلمانوں سے یہ کہتے کہ ہم مسلمان ہیں، قرآن اور اس کی ہدایات کو مانتے ہیں، تمھارے ساتھ ہیں، اور دلوں میں اُن کے کفر و انکار تھا، کفار کی مجلسوں میں جاکر یہ کہتے کہ ہم تمھارے عقیدے پر اور تمھارے ساتھ ہیں، مسلمانوں کو دھوکہ دینے اور ان کے راز معلوم کرنے کے لئے ہم اُن سے ملتے ہیں۔

اس گروہ کا نام قرآن کی اصطلاح میں منافق ہے، یہ پندرہ آیتیں ہیں جو قرآن کو نہ ماننے والوں کے متعلق نازل ہوئی ہیں، ان میں سے مذکورہ دو آیتوں میں کُھلے کافروں کا ذکر ہے، اور آگے تیرہ آیتوں میں منافقین کا ذکر اور ان کے متعلقہ حالات و علامات اور ان کا انجام مذکور ہے۔

ان تمام آیات کی تفصیل پر یکجائی نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حکیم نے سورۂ بقرہ کی ابتدائی بیس آیتوں میں ایک طرف تو چشمۂ ہدایت کا پتہ دیدیا، کہ وہ قرآن ہے، اور دوسری طرف تمام اقوامِ عالم کو اسی ہدایت کے قبول یا انکار کے معیار سے دو حصّوں میں تقسیم کردیا، ایک ہدایت یافتہ جن کو مؤمنین و متقین کہا جاتا ہے، دوسرے ہدایت سے انحراف و انکار کرنے والے جن کو کافر یا منافق کہا جاتا ہے۔

پہلی قسم وہ ہے جن کا راستہ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ میں طلب کیا گیا ہے، اور دوسری قسم وہ ہے جن کے راستہ سے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ، میں پناہ مانگی گئی ہے۔

قرآن کریم کی اِس تعلیم سے ایک اصولی مسئلہ یہ بھی نکل آیا کہ اقوامِ عالم کے حصّوں یا گروہوں میں ایسی تقسیم جو اصول پر اثرانداز ہوسکے وہ صرف اصول و نظریات ہی کے اعتبار سے ہوسکتی ہے،

نسب، وطن، زبان، رنگ اور جغرافیائی حالات ایسی چیزیں نہیں جن کے اشتراک یا اختلاف سے قوموں کے ٹکڑے کئے جاسکیں، قرآن کریم کا اس بارے میں واضح فیصلہ بھی سورۂ تغابن میں مذکور ہے:

خَلَقَكُمْ فَمِنْكُمْ كَافِرٌ وَّمِنْكُمْ مُّؤْمِنٌ ؕ (۲:۶۴)

"یعنی اللہ نے تم سب کو پیدا کیا، پھر کچھ لوگ تم میں سے مؤمن اور کچھ کافر ہوگئے۔"

مذکورالصدر دو آیتوں میں حق تعالیٰ نے اُن کافروں کا ذکر فرمایا ہے جو اپنے کفر و انکار میں ضد اور عناد تک پہنچ گئے تھے، اور اس ضد کی وجہ سے وہ کسی حق بات کو سننے اور روشن دلیل کو دیکھنے کے لئے بھی تیار نہ تھے، ایسے لوگوں کے بارے میں سُنّۃ اللہ یہی ہے کہ ان کو ایک سزا اسی جہان میں نقد یہ دی جاتی ہے کہ اُن کے دلوں پر مُہر لگادی جاتی ہے، کانوں، آنکھوں کو حق و صدق کے قبول کرنے سے بند کردیا جاتا ہے، اُن کا حال حق و صدق کے بارے میں ایسا ہوجاتا ہے کہ گویا نہ اُن کو سمجھنے کی عقل، نہ دیکھنے کے لئے آنکھیں نہ سننے کے لئے کان۔

آخر آیت میں ایسے لوگوں کا عذابِ عظیم میں مبتلا ہونا ذکر کیا گیا ہے۔

کفر کی تعریف کفر کے لفظی معنی چھپانے کے ہیں، ناشکری کو بھی کفر اس لئے کہتے ہیں کہ محسن کے احسان کو چھپانا ہے، اصطلاحِ شریعت میں جن چیزوں پر ایمان لانا فرض ہے ان میں سے کسی چیز کے انکار کا نام کفر ہے، مثلاً ایمان کا خلاصہ یہ ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے ہیں اور اس کا ثبوت قطعی و یقینی ہے اُن سب چیزوں کی دل سے تصدیق کرنا، اور حق سمجھنا، اس لئے جو شخص رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُن تعلیمات میں سے جن کا ثبوت یقینی اور قطعی ہے کسی ایک کو بھی حق نہ سمجھے اور اس کی تصدیق نہ کرے وہ کافر کہلائے گا۔

اِنْذَار کے معنی لفظ انذار، ایسی خبر دینا جس سے خوف پیدا ہو، جیسا کہ ابشار ایسی خبر دینے کو کہتے ہیں جس سے سرور پیدا ہو، اردو زبان میں اس کا ترجمہ "ڈرانے" سے کیا جاتا ہے، مگر درحقیقت مطلقاً ڈرانے کو انذار نہیں کہتے، بلکہ ایسا ڈرانا جو شفقت و رحمت کی بناء پر ہو، جیسے اولاد کو آگ سے، سانپ بچھو اور درندوں سے ڈرایا جاتا ہے، اسی لئے جو ڈاکو، چور، ظالم، کسی انسان کو دھمکاتے ڈراتے ہیں اس کو انذار اور ان لوگوں کو نذیر نہیں کہا جاتا، انبیاء علیہم السلام کو خصوصیت سے نذیر کا لقب دیا جاتا ہے، کہ وہ ازراہِ شفقت آئندہ آنے والے مصائب سے ڈراتے ہیں، انبیاء علیہم السلام کے لئے اس لفظ کو اختیار کرنے میں اس کی ہدایت ہے کہ مصلح و مبلغ کے لئے ضروری ہے کہ مخاطب کی خیرخواہی کیساتھ ہمدردی سے گفتگو کرے، محض ایک کلمہ پہنچا دینا مقصد نہ ہو۔

اس آیت میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلّی دینے کے لئے یہ بتلایا گیا ہے، کہ یہ ضدّی اور

معاند کفار جو حقیقت کو پہچاننے کے باوجود کفر و انکار پر جمے ہوئے ہیں، یا اپنے تکبر اور کج رائی کی بنا پر کسی حق بات کو سننے اور روشن دلائل کو دیکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں، ان کی اصلاح اور ایمان کے متعلق جو آپ کوشش کرتے ہیں اُن کے لئے مؤثر ثابت نہ ہوگی، بلکہ آپ کا کوشش کرنا اور نہ کرنا اُن کے حق میں برابر ہے۔

اس کی وجہ اگلی آیت میں یہ بتلائی گئی کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے، اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے، سوچنے سمجھنے کے جتنے راستے تھے وہ سب بند ہیں، اس لئے ان سے اصلاح کی توقع رکھنا دردسری ہے۔

کسی چیز پر مُہر اس لئے لگائی جاتی ہے کہ باہر سے کوئی چیز اس میں داخل نہ ہو سکے، ان کے دلوں اور کانوں پر مُہر لگانے کا یہی مطلب ہے کہ ان میں قبولِ حق کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔

اُن کی اس حالت کو دلوں اور کانوں پر تو مُہر کرنے سے تعبیر فرمایا ہے، مگر آنکھوں کے لئے مُہر کے بجائے پردہ پڑنے کا ذکر کیا گیا، اس میں حکمت یہ ہے کہ دلوں میں آنے والا کوئی مضمون یا کوئی فکر و خیال کسی ایک سمت سے نہیں آتا، ہر طرف سے آسکتا ہے، اسی طرح کانوں میں پہنچنے والی آواز بھی ہر سمت اور ہر جہت سے آسکتی ہے، ان کی بندش جب ہی ہو سکتی ہے جب اُن پر مُہر کردی جائے بخلاف آنکھوں کے کہ ان کا ادراک صرف ایک سمت یعنی سامنے سے ہو سکتا ہے، اور جب سامنے پردہ پڑجائے تو آنکھوں کا ادراک ختم ہو جاتا ہے۔ (مظہری)

(۱) گناہوں کی دنیوی سزا سلبِ توفیق

ان دونوں آیتوں سے معلوم ہوا کہ کفر اور ہر گناہ کی اصل سزا تو آخرت میں ملیگی، مگر بعض گناہوں کی کچھ سزا دنیا میں بھی مل جاتی ہے، پھر یہ دنیا کی سزا بعض اوقات یہ شکل اختیار کرتی ہے کہ اصلاح حال کی توفیق سلب ہو جاتی ہے، انسان آخرت کے حساب و کتاب سے بے فکر ہو کر اپنی نافرمانیوں اور گناہوں میں بڑھتا چلا جاتا ہے، اور اس کی بُرائی کا احساس بھی اس کے دل سے جاتا رہتا ہے، ایسے حال کے متعلق بعض بزرگوں کا ارشاد ہے اِنَّ مِنْ جَزَاءِ السَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ بَعْدَهَا وَاِنَّ مِنْ جَزَاءِ الْحَسَنَةِ الْحَسَنَةُ بَعْدَهَا "یعنی گناہ کی ایک سزا یہ بھی ہوتی ہے کہ ایک گناہ دوسرے گناہ کو کھینچ لاتا ہے جس طرح نیکی کا نقد بدلہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک نیکی دوسری نیکی کو کھینچ لاتی ہے"۔

اور حدیث میں ہے کہ انسان جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب پر ایک سیاہ نقطہ لگ جاتا ہے اور جس طرح سفید کپڑے پر ایک سیاہ نقطہ انسان کو ناگوار نظر آتا ہے، پہلے نقطۂ گناہ سے بھی انسان پریشان ہوتا ہے، لیکن اگر اس نے اس گناہ سے توبہ نہ کی اور دوسرا گناہ کر لیا تو ایک دوسرا نقطۂ سیاہ لگ جاتا ہے، اور اسی طرح ہر گناہ پر سیاہ نقطے لگتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ یہ سیاہی سارے قلب پر محیط ہو جاتی

ہے، اور اب اس کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ وہ نہ کسی اچھی چیز کو اچھا سمجھ سکتا ہے نہ بُری چیز کو بُرا غرض نیکی بدی کا امتیاز اس کے دل سے اُٹھ جاتا ہے، اور پھر فرمایا کہ اسی ظلمت و سیاہی کا نام قرآن کریم میں رَان یا رَین آیا ہے، كَلَّا بَلْ سكتہ رَانَ عَلٰى قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ o (مشکوٰۃ از مسند احمد و ترمذی)

اور ترمذی نے سند صحیح کے ساتھ بروایت ابو ہریرہؓ نقل کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انسان جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کا دل سیاہ ہو جاتا ہے، پھر اگر وہ توبہ کرلے تو صاف ہو جاتا ہے (قرطبی)

(۲) نصیحت ناصح کے لئے ہر حال میں مفید ہے، مخاطب قبول کرے یا نہ کرے

اس آیت میں ازلی کافروں کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وعظ و نصیحت کرنا اور نہ کرنا دونوں برابر قرار دیئے گئے ہیں، مگر اُنکے ساتھ عَلَيْهِمْ کی قید لگا کر بتلا دیا کہ یہ برابری کفار کے حق میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں نہیں، بلکہ اُن کو تو تبلیغ و تعلیم اور اصلاحِ خلق کی کوشش کا ثواب بہر حال ملے گا، اسی لئے پورے قرآن کریم کی کسی آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے لوگوں کو بھی دعوتِ ایمان دینے سے روکا نہیں گیا، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص دعوتِ دین اور اصلاح کا کام کرتا ہے خواہ مؤثر ہو یا نہ ہو اس کو بہر حال اپنے عمل کا ثواب ملتا ہے۔

ایک شبہ کا جواب

اس آیت کا مضمون وہی ہے جو سورۂ مطففین کی اس آیت کا ہے: كَلَّا بَلْ سكتہ رَانَ عَلٰى قُلُوبِهِم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ o (۸۳: ۱۴) "یعنی ایسا نہیں، بلکہ اُن کے دلوں پر ان کے اعمال کا زنگ بیٹھ گیا ہے"، جس میں حقیقت واضح کر دی گئی ہے کہ ان کی بداعمالیاں اور سرکشی ہی ان کے دلوں کا زنگ بن گیا ہے، اسی زنگ کو آیتِ مذکورہ میں مُہر یا پردہ کے لفظوں سے تعبیر کیا گیا ہے، اس لئے اس پر یہ شبہ نہیں ہو سکتا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہی اُن کے دلوں پر مہر کر دی، اور حواس کو ماؤف کر دیا ہے تو یہ اپنے کفر میں معذور ہو گئے، پھر اُن کو عذاب کیسا؟ وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں نے شرارت و عناد کرکے باختیار خود اپنی استعداد برباد کرلی ہے، اس لئے اس تباہیِ استعداد کے فاعل اور مسبب یہ خود ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے تمام افعال کے خالق ہونے کی حیثیت سے اس جگہ مہر کرنے کو اپنی طرف نسبت کرکے یہ بتلا دیا کہ جب ان لوگوں نے قبولِ حق کی صلاحیت و استعداد کو اپنے اختیار سے تباہ کرنا چاہا تو سنتِ الٰہیہ کے مطابق ہم نے وہ بد استعداد کی کیفیت اُن کے قلوب اور حواس میں پیدا کر دی۔

وقف لازم

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸﴾

اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں ہم ایمان لائے اللہ پر اور دن قیامت پر اور وہ ہرگز مومن نہیں،